# لارنس باغ، لاہور

(سائیں سچّا)

کیپ ٹاؤن، جنوبی افریقہ، 2014

کروُگر پارک سفاری کا سفر شروع ہونے سے پہلے یہ ہماری تعارفی ملاقات تھی۔ ہمارا راہبر ہمیں اس سفر کے مختلف لوازمات سمجھا رہا تھا، اچانک رُک کر اُس نے سب سے پوچھا-- کیا تم میں سے کسی نے قریب سے شیر کو دھاڑتے ہوئے سُنا ہے؟

سب نے انکار میں سر ہلایا، مگر میں مُسکرا رہا تھا۔

-تم نے سُنا ہے؟

-اپنی زندگی کے پہلے اُنیس سال تقریبا" ہر روز۔

سب میری طرف دیکھنے لگے۔

لاہور میں ہمارا مکان چڑیا گھر کے قریب ہی تھا، چنانچہ ہر شام اور کبھی کبھی صبح کے وقت شیروں کو دھاڑتے سننے کے عادی تھے۔ معلوم نہیں وہ اور کیا بولتا رہا، مگر میں نے اپنا بدن تو وہیں چھوڑا، لیکن خود کو خیالی کھٹولے میں بیٹھائے لارنس باغ چل دیا۔

جب ہم چھوٹے تھے تو ہمارے والد ہر سحر ہمیں ساتھ لئے لارنس آتے تھے۔ وہاں میں اور میرے دوست صبح صبح کسرت کرتے اور دوڑ لگاتے۔ والد صاحب خود بھی کسی زمانے میں ایف سی کالج کے لئے ہاکی اور کبڈی کھیل چُکے تھے، اور ہمارے اچھے بھلے ساتھی بھی تھے۔ چند سالوں بعد جب ہم بارا، تیرا برس کے ہو گئے تو انہوں نے ہمارے ساتھ آنا چھوڑ دیا۔ اب رہ گیا داؤد، سکندر، رزاق اور بشیر کا گروہ جو بہت برس باقاعدہ یہ صبح کا چکر لگاتے رہے۔ بہت خوبصورت دن تھے-- گھر سے کوینز روڈ پانچ منٹ میں، پھر اُس پر کھڑی کوٹھیوں میں ٹلّی پھولوں کی جھاڑیوں سے اُن کا رس چوستا جاتا، اور پھر گیند پھینکتے پھینکتے ہم لارنس پہنچ جاتے۔ سبز گھاس، اُس پر شبنم کے موتی، جنہیں روندتے ہوئے پہلے ہم ہاکی والے گراؤنڈ کے دو یا تین چکر لگاتے اور پھر چار یا پانچ، سو میٹر کی دوڑیں۔ ساتھ کے چڑیا گھر سے کبھی شیر کی ڈھاڑ، کبھی مور کی پُکار اور کبھی طوطوں کے غولوں کی ٹیں ٹیں اور نہ جانے کیا کیا۔ ہم نے کتنی بار دیوار ٹاپ کر چڑیا گھر کی سیر کی، کچھ یاد نہیں۔ لیکن وہ سلاخوں کے پرے شیروں کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر دیکھنا، بندروں کو منہہ چڑھانا، بن مانس کے ساتھ ساتھ ٹہلنا، طوطوں سے باتیں کرنا اور بعد میں مالیوں کا ہمارے پیچھے بھاگنا یاد ہے۔ بھلا ہو اُن دوڑوں کا ہم زندگی بھر کبھی کسی سے نہ پکڑے گئے!

وقت گزُرتا رہا! ہم سب صبح کی دوڑ چھوڑ کر شام کو کھلکھلاتی ہنسیوں، پھُولوں اور بدنوں کی مہک، اُڑتے پرندوں اور لہراتے ڈوپٹّوں، چمکتی آنکھوں اور دمکتے جگنوؤں کے ساتھ ساتھ پھرنے لگے۔

یہ سن انیس سو چھپن سے لے کر ساٹھ تک کا ذکر ہے۔ چھپن سے پہلے کوئی آمر نہیں آیا تھا، اور ساٹھ کے بعد صرف آمر ہی آئے۔ اس لئے میرے خیال میں یہ پاکستان، اور خاص طور پر لاہور، کی تاریخ کا رنگین ترین وقت تھا۔ کُتّے اور مولوی تب بھی

بھونکتے تھے، مگر ابھی تک ان کی اتنی ہمت نہیں تھی کہ کاٹیں بھی۔ ساٹھ میں فوجی آ گئے تھے لیکن اُن کا رویہ یوں تھا جیسے اپنی ہی قوم کے سپاہی ہوں۔ ویسے بھی ان کے چہروں پر عربوں کی پسندیدہ جھاڑیاں اور ہاتھوں میں مغرب کے بخشے ہوئے ہتھیار ابھی نہ آئے تھے۔

بہر حال، اُن دنوں لارنس باغ کی، شدید سردیوں کے علاوہ، ہر شام ایک چراغوں کے میلے والی شام تھی۔ سورج کی آنکھ بند ہونے سے پہلے ہی لوگوں کے غول کے غول لارنس کی جانب چل پڑتے تھے۔ بڑے، چھوٹے، بوڑھے یا جوان سب اپنے دوستوں، رشتہ داروں یا محلہ داروں سمیت لارنس کا رخ کرتے۔ ابھی عورتوں کو ہراس کرنا یا چھیڑنا پاکستانی مردوں کی مردانگی میں شامل نہ تھا، بلکہ خیال کیا جاتا تھا کہ ایسے بدفطرت لوگ وہاں نہ آئیں۔ گلشنِ فاطمہ ابھی نیا نیا ہی بنا تھا۔ گرمیوں میں وہ جگنوؤں کا آشیانہ تھا۔ ہزاروں، لاکھوں جگمگاتے ہیرے فضا میں تیرتے رہتے۔ یہ حصہ خواتین کے لئے مخصوص تھا، لیکن ہم بھی کسی مفروضہ پیاری کی تلاش میں وہاں کا چکر لگا لیتے۔ یہ میلارات کو دیر تک لگا رہتا، اور ہم لوٹ کر بستر پر صرف فرضی نیند کے لئے ہی لیٹتے تھے۔

یہ میرے کالج کے دن تھے۔ ہمارے گروہ سے بشیر اور رزاق غائب ہو چکے تھے، اُن کی جگہ روفی، سلیم اور سجاد نے لے لی تھی۔ سب کے سب سُبک سوچ کے مالک، بڑی کاٹ والے مزاح کے مشاق اور شعر و شاعری کے دلدادہ تھے۔

یہ اور بات ہے کہ ہمارے لئے یہ دن ابھی چھُونے کے دن نہ تھے – بس کی جئے نظارہ دور دور سے!

اکتوبر 1960، میں نے پاکستان چھوڑ دیا اور برطانیہ چلا آیا، اور پھر 1965 سے میں سویڈن رہ رہا ہوں۔

کتنی یادیں اور کتنی کہانیاں لارنس سے وابستہ تھیں، اور بہت سی تو آج بھی یاد ہیں۔

واجب ہے کہ میں درج کروں کہ لارنس باغ کو لارڈ جون لارنس (Lord John Lawrence) نے 1862 میں لندن کے کیو باغ (Kew Botanical Gardens) کو ذہن میں رکھ کو بنوایا تھا۔ اس میں دنیا بھر سے خوش شکل، خوشبودار اور نایاب درخت اور پودے منگوا کر لگوائے گئے تھے۔ اس میں دو چار انتہائی خوبصورت پہاڑیاں بھی تھیں جہاں پھولدار درخت اور معطر جھڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ جوانی شادابی اور شوخ ماحول میں بسر ہوئی تھی۔

اس کا نام جناح باغ کیوں رکھا گیا کچھ سمجھ میں نہیں آتا- جناح نے تو اس میں کوئی کیکر یا نیم کا درخت بھی نہیں لگوایا تھا۔ لیکن ایسی قومیں جن کے سر براہ چکلے کی اُن مجبور رنڈیوں کی مانند ہوں جو اپنے نومولد بچّوں کا نام فرضی نوابوں اور اشرفیاء کے ساتھ منسوب کرتی رہتی ہیں کہ نوابی تو نہ ملے گی شائد کوئی عطیہ ہی مل جائے، پاکستان کے موقع پرست سیاستدان اپنے اصلی حبیبوں کو فراموش کر کے عرب ممالک کے جابروں سے بھیک مانگنے کے لئے اپنی سڑکوں، باغوں اور عمارتوں کے نام ان لوگوں سے منسوب کرتے رہے جن کا پاکستان سے کوئی تعلق ہی نہیں، سوائے اس کے کہ وہ یہاں کے جوانوں کو بطور غلام استعمال کرنا چاہتے تھے۔ میرے لئے لارنس باغ، ہمیشہ لارنس باغ ہی ہے اور رہے گا۔